مقالات

اسلامی قانون اور نظامِ معاشرت

(۳)

ترجمہ مولوی ابو نصر محمد خالدی صاحب

(ماخوذ از "لیگیسی آف اسلام")

تعزیری قوانین اسلام کے تعزیری نظام کے متعلق زیادہ کہنا نہیں ہے۔ یہ انتقام کے ابتدائی تصور اور یہودی قانون کے "آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان" والے اصول پر مبنی ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی تعزیری قانون میں ہم کو بغیر کسی کمی کے وہی قدیم نظریات ملتے ہیں جو توریت میں مرقوم ہیں۔ ان تصورات کی قدر و قیمت تاریخی اور رواجی حیثیت سے ہے[1]۔ بعد کے فقہاء نے، باوجود اس کے کہ خود اہلِ عرب میں خیالات کی ترقی بہت کچھ ہوئی، قرآن کے الفاظ سے ہٹنے کی جرأت نہیں کی، البتہ وہ توجیہ و تاویل کے ذریعے

[1] فاضل پروفیسر نے یہاں خالص علمی حیثیت سے اسلام کے تعزیری قانون پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بجائے ان متعصبانہ مفروضات پر تکیہ کر لیا ہے جو یورپ میں پہلے سے شائع و ذائع ہیں۔ زمانۂ حال میں مغرب کے قانونی نظریات کا نشو و نما جس ڈھنگ پر ہوا ہے اس کا تمام تر رجحان اس طرف ہے کہ سوسائٹی کے بجائے مجرم افراد کے ساتھ زیادہ ہمدردی، رحم اور شفقت کا برتاؤ کیا جائے۔ اس وجہ سے اہلِ مغرب کے نزدیک کسی قانون کے مہذب اور ترقی یافتہ ہونے کا معیار یہ قرار پا گیا ہے کہ وہ سوسائٹی کے امن کو غارت کرنے والے اور اجتماعی حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والے اور سوسائٹی میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے والے مجرمین کے ساتھ کس قدر نرمی برتتا ہے اور انہیں کتنی لمبی قسطوں میں عذاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۵ پر ملاحظہ کریں)

قرآنی احکام کو سختی کے ساتھ نافذ کرنے سے گریز کرنے لگے۔[۵۵]

بقیہ حاشیہ ۵۴ - دیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جو شخص اسلامی قانون کو دیکھے گا، ظاہر ہے کہ اسکو وہ بدنی سزائیں بہت سخت معلوم ہونگی جو قرآن اور توراۃ میں تجویز کی گئی ہیں، کیونکہ وہ مغرب کے انفرادیت پرستانہ رجحان کے بالکل برعکس ایک دوسرے رجحان پر مبنی ہیں۔ اسلامی قانون کا رجحان اس طرف ہے کہ فرد کی بہ نسبت جماعت زیادہ ہمدردی اور رحم کی مستحق ہے۔ وہ فرد کے جسم کی بہ نسبت جماعت کے اخلاق اور اجتماعی زندگی کے امن کو زیادہ عزیز رکھتا ہے، اور اس کے نزدیک کسی قانون کے مہذب ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ حیات اجتماعی کے نظم کو انتشار اور بدنظمی پھیلانے والی قوتوں کی دراندازی سے کس حد تک محفوظ کرتا ہے۔ یہ دو مختلف قانونی رجحانات اور نظریات ہیں۔ ایک محقق عالم ان میں سے جسکو پسند کرے اسکی تائید میں اور جسے ناپسند کرے اسکی تردید میں دلائل پیش کرسکتا ہے۔ مگر یہ بات شان تحقیق سے بالکل گری ہوئی ہے کہ آدمی کسی قانونی نظریہ کی تردید کے بجائے اسکی قدامت کو بطور دلیل پیش کرے، یا "عدل" کے تصور کو "انتقام" کے لفظ سے تعبیر کرکے یہ سمجھ لے کہ اس نے بس اپنی اس لفظی تعبیر ہی سے اسکی کافی تردید کردی ہے۔ - ترجمان القرآن

۵۵ یہاں پروفیسر صاحب واقعات کے بجائے خود اپنے خیالات کا عکس پیش فرمارہے ہیں۔ چونکہ ان کے نزدیک قرآن کے احکام غیر مہذب اور وحشیانہ ہیں، اور ان کا مفروضہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن میں ترقی کرنے کے بعد مسلمانوں کو ان احکام پر عمل نہ کرنا چاہیے تھا، اسلیے انہوں نے قرآنی تعزیرات کے نفاذ میں فقہائے اسلام کی احتیاط کو یہ معنی پہنا دیے کہ یہ فقہاء خود بھی ان احکام کو وحشیانہ سمجھتے تھے اور لفظاً ان پر ایمان لانے کے باوجود عملاً ان کو نافذ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ واقعات کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالنے کی یہ اچھی خاصی لطیف کوشش ہے۔ مگر شائد فاضل پروفیسر کی نگاہ اس حدیث پر نہیں پڑی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مسلمانوں کی پیٹھوں کو حدود سے بچاؤ جہاں تک ممکن ہو" اور یہ حدیث بھی شائد انہوں نے نہیں دیکھی کہ "ملزم کو بری کرنے میں امام کا غلطی کرجانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے" اور شائد ان احادیث سے بھی وہ واقف نہیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجرموں کے خود اقبال جرم کرلینے پر بھی انہیں سزا دینے

شریعت کا تزکیہ | کیا وسیع ترین مفہوم میں بھی اسلام کے قانونی ترکے کے متعلق گفتگو کی جا سکتی ہے۔؟
رائج الوقت رائے کے مطابق تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا ہی بے سود ہے کہ مشرقی و مغربی قانون کا کوئی نقطہ اتصال ہے، اسلیے کہ اعتقاد کے سخت دائرہ میں محدود رہ کر وہ ہمارے کلیات تک نزول نہیں کرسکتا۔ چونکہ وہ مذہبی قانون ہے لہذا ہمارے تخیلات سے مختلف ہے اور اس میں نشو و ارتقار کی بالکل صلاحیت نہیں۔ اس حیثیت سے دو نمایاں نقاط نظر کو عام طور پر گڈمڈ کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ نصرانیت اور دوسرے ادیان کی طرح اسلام کے بھی چند خاص معتقدات ہیں جنہیں اس کے پیرو بحث و تمحیص کے لیے پیش نہیں کرسکتے۔ لیکن اسلامی قانون پر جامد ہونے کا الزام لگانا ایسا ہی نادرست ہوگا جیسا کہ نصرانیت پر اسی قسم کا الزام لگانا۔ ہر بڑے مذہبی نظام میں صرف اعتقادات ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ سینٹ طامس اکیوناس (S.. Thomas Aquinas) نے بالکل سچ کہا ہے کہ "قانون کے آخری مقصد یعنی رفاہ عامہ کے مآخذ، اشخاص حالات اور ادوار کے مطابق بہت مختلف ہوتے ہیں"۔ اسلامی مفکرین اس چیز کو بالکل واضح طور پر سمجھے ہوئے تھے۔ ارسطو کے سیاسی نظریات نے دین کے الہامی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۵ ــ میں کسقدر تامل فرماتے تھے۔ اور شائد انہوں نے اس بات پر بھی نظر نہیں فرمائی کہ قرآن اور حدیث کی رو سے جن اخلاقی و معاشرتی جرائم کی سزائیں سخت ہیں، انکے ثبوت کی شرائط بھی سخت رکھی گئی ہیں۔ اگر یہ سب باتیں بھی پروفیسر صاحب کی نظر میں ہوتیں تو انہیں خود معلوم ہو جاتا کہ قرآن کے تعزیری احکام کو نافذ کرنے میں فقہائے اسلام نے جو احتیاطیں برتی ہیں وہ دراصل اسلامی قانون کی اسپرٹ اور عہد رسالت و عہد صحابہ کے عدالتی نظائر پر مبنی ہیں، نہ کہ ان تخیلات پر جنہیں بیسویں صدی میں ایک یورپین پروفیسر ہی کا دماغ جنم دے سکتا ہے۔ ترجمان القرآن

ےہ "اسلام کے قانونی ترکہ" سے پروفیسر صاحب کی مراد وہ اثرات ہیں جو زمانۂ حال کے مغربی قوانین نے اسلام سے قبول کیے۔ ترجمان القرآن

اصول سے مل کر عربی علوم میں ایک ایسا نظام پیدا کیا جو عہد وسطیٰ کے نصرانی سیاسی تخیلات سے ایک حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ یہ تشابہ قدرتی ہونے کے ساتھ نمایاں بھی ہے[1]۔ اسی پر ہم مختصراً گفتگو کریں گے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، معاشرہ ایک حقیقت ہے، یہ کوئی پراگندہ انبوہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا اجتماع ہے جو مشترک مقصد کی وجہ سے قایم اور باہمی امداد کی بندشوں سے مربوط ہے۔ اس لیے مملکت کا معاشری اور اخلاقی تصور یہ قرار پاتا ہے کہ "حکومت کا مقصد دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کے حصول میں مدد دینا ہے"۔ معاشرت ہی کے ڈھانچہ سے قانونی نظام متعین ہوتا ہے۔ اور درحقیقت قانون کا جواز بھی اسی لیے نکلتا ہے۔

قانون کے آغاز کی نشاندہی مسلمان بھی بالکل ویسی ہی کرتے ہیں جیسی کہ اس کے متعلق نصرانی نظریہ میں بیان کی گئی ہے۔ یعنی تاریخی دور کی ابتداء میں ایک ایسا وقت بھی گذرا ہے جب سارے انسان ایک امت تھے۔ برائیوں سے ناواقف ابتدائی انسان فطری قوانین کے احکام کے مطابق پُرامن مزاج (انارکی) کی حالت میں تھا۔ قابیل کے جرم کے ساتھ ہی سنہری دور کا خاتمہ ہو گیا۔ انسان کے جذبات نے غلبہ حاصل کر کے معاشری پراگندگی پیدا کی جس سے حقیقی دین کو نقصان پہنچا اور مخصوص قوانین جاری کیے گئے۔

---

[1] یہ صحیح ہے کہ دور متوسط کے مسلمانوں نے یونان اور روم و عجم کے اخلاقی، سیاسی اور فلسفیانہ افکار و نظریات کا جوڑ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ملا کر ایک ایسا نظام بنا لیا تھا جسے خالص اسلامی نظام کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ مگر یہ مسلمانوں کا فعل تھا نہ کہ اسلام کا۔ اسلام نے کسی ارسطو اور کسی افلاطون سے کچھ نہیں لیا۔ وہ خود اپنے مستقل نظریات اور اصول رکھتا ہے، اور جب اسلام کے عنوان پر کوئی بحث کی جائے تو صحیح یہ ہے کہ تمام تر گفتگو قرآن اور سیرت رسول اللہ، یا حد سے حد خلفاء راشدین کے طریقہ تک محدود رہے۔ لیکن مغربی مصنفین عموماً یہ غلطی کرتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کو ایک چیز قرار دے لیتے ہیں، اور اسلام کا عنوان دیکر ایک ہی مضمون میں قرآن و سنت اور مسلمان مفکرین کے خیالات اور مسلمان سلاطین و اہل سیاست کے افعال

قانون کا مقصد برائی کو روکنا ہے۔ اس سے دو اصول نکلتے ہیں: مساوات اور تقویٰ۔

۱۔ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ "گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ عربی کو عجمی پر، اپنے خالق کے سامنے سب انسان مساوی ہیں"۔ چونکہ سب مسلمان اللہ کے آگے مساوی درجہ رکھتے ہیں اور ان کی حیثیت ایک ایسے خاندان کے ارکان کی ہے جس میں کوئی شریف ہے نہ رذیل بلکہ سب کے سب مسلمان ہیں اس لیے وہ کشوری قانون کے آگے بھی مساوی المرتبت ہیں۔ اس مساوات کا اعلان ایسے زمانے میں کیا گیا جب کہ تمام مسیحی معاشرہ اس سے عملاً ناواقف تھا۔

۲۔ سب کے لیے مساوی حیثیت رکھنے والے اس قانون کی بنیاد لازماً تقویٰ پر ہے۔ ہر مسلمان کو اپنا عہد پورا کرنا چاہیے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے مال سے بغیر اس کی منظوری کے استفادہ نہیں کر سکتا۔ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے لہٰذا وہ اس پر نہ تو ظلم کرے اور نہ اسکی بے عزتی کرے"۔ "جس شخص نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی اور چیز پر دست درازی کی ہو اسے چاہیے کہ اس سے معاف کرائے"۔ یہ اور اسی قسم کی بہت سی حدیثیں اسلامی قانون کے عام اصول ہیں۔ تقویٰ کا تصور دراصل اخلاقی ہے جس کو اسلام میں ایک عالمگیر مسلک اور اجتماعی طریق عمل کے درجہ تک ترقی دی گئی ہے۔ یہ بات ہم کو متاثر کرتی ہے، کیونکہ دیانت و راستبازی کے اُس جرمانی اور جاگیرداری تصور کی بہ نسبت، جو کہ شخصی وفاداری کے ساتھ وابستہ تھا، یہ اسلامی تصور پرہیزگاری ہمارے ضمیر سے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون انسان کی نیت کو اسکے تمام اعمال کی بنا قرار دیتا ہے۔ اسکی نگاہ میں اصلی اہمیت ظاہری افعال یا الفاظ کی نہیں بلکہ نیت اور ارادہ کی ہے۔ نیت اور ارادے کا اظہار خواہ کسی طرح ہو، وہ قانونی حدود پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اسلامی قانون میں ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ کوئی حکم محض فعل کی ظاہری صورت پر یا محض الفاظ پر لگا دیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں ذرا جرمانی ضابطہ کی اُن رسمی تفصیلات پر ایک نظر ڈالیے جن کا سلسلہ کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔

اسلامی قانون کے ماہرین نے ایک بڑا اہم اصول جو طے کیا ہے وہ یہ ہے کہ اجماع بھی قانون کے مآخذ میں سے ایک ماخذ ہے یعنی یہ کہ جو بات ایک دفعہ امت میں بالاتفاق طے ہو چکی وہ اب قانون ہے۔ افراد کو اس سے انحراف کا حق نہیں رہا۔

چونکہ معاشری سود و بہبود ہی اسلامی قانون کے مدنظر ہے اس لیے وہ بالکل ہمارے ہی قانون کی طرح لازمی طور پر ترقی کرنے والا قانون ہے۔ وہ قابل تغیر ہے اور حالات و ضروریات کے ساتھ بدلتا ہے۔ فقہ کے بڑے مذاہب کا اس نقطہ پر اتفاق ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ "قانونی احکام ناقابلِ تبدیلی نہیں ہیں کیونکہ وہ منطق یا نحو کے قاعدے نہیں ہیں۔ جو کچھ واقع ہوتا ہے یہ اس کا اظہار کرتے اور ان حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں جو واقعات سے پیدا ہوں"۔ عرب اس لچک کے سبب کو نہایت واضح طور پر دیکھ چکے تھے۔ معاشرے زندہ نظام ہوتے ہیں اور اپنے دوران حیات میں مسلسل تبدیلیوں سے گذرتے رہتے ہیں "حضرت آدم کے زمانے میں انسان کی حالت کمزور اور پر آلام تھی۔ اللہ کا رحم بہت سے دوسرے معاملات تک وسیع تھا۔ جب معاشرہ زیادہ وسیع اور مختلف الہیئت ہو گیا تو قوانین میں اضافہ ہوا"۔ زندگی کا یہ تسلسل پوری اسلامی تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر (صلعم) کے صحابہ کسی حکم کی غیر موجودگی میں مصلحت کی بناء پر مختلف فیصلوں پر پہنچتے تھے۔ مثلاً انہوں نے فیصلہ کیا کہ قرآن کو لکھ لینا چاہیے اگرچہ ان کو ایسا کرنے کا اختیار کسی حکم یا قول کی بناء پر نہیں تھا۔ حکومت کی مختلف شاخوں کے لیے انھوں نے دفاتر قائم کیے، سکے ڈھالے اور بندی خانے بنائے۔ مصلحت ہی کی بناء پر شریعت قانونی گواہوں کی شہادت ان سخت شرائط کے تحت تسلیم کرتی ہے جن کا ذکر احادیث میں موجود نہیں ہے ..... یہاں تک کہ ضرورتاً اُس نے بعض معاہدوں مثلاً قرضوں کی تعبیر نہایت وسیع کی ہے ....."

یہ ہیں اس اقتدار کی بنیادیں جو مسلمان مقننوں نے رواج کو دیا ہے۔ یہ ایک قسم کا غیر مکتوب

قاعدہ ہے جو قانون وضع کرنے بلکہ اس میں ترمیم کرنے کی قوت بھی رکھتا ہے۔ "جس کو مومن پسند کرتا ہے اس کو اللہ بھی پسند کرتا ہے"۔ جب کوئی رواج باقاعدہ ہو، مستحکم ہو، اور تقویٰ یا شریعت کے عام اصولوں کے خلاف نہ ہو تو پھر عمل درآمد کو بھی قانون ہی کا سا اقتدار حاصل ہوتا ہے اور وہ شریعت ہی کا لازمی جزو ہو جاتا ہے۔

احناف کہتے ہیں کہ "ضرورت نے بہت سی ایسی چیزوں کو جائز کر دیا ہے جو سخت اصول کے اعتبار سے جائز ہونے کے لائق نہیں تھیں"۔ مثلاً مقروض کی حالت درست رکھنے کے لیے رہن جائز ہے۔ نظری طور پر قرضہ پر منافع لینے کی ممانعت ہے کیونکہ اکثر ابتدائی معیشتوں کی طرح یہ سرعت سے نامناسب سود تک پہنچ جاتا ہے[1] اور ابتدائی معمولی منافع ہی بڑھ کر اپنے حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم دوامی پٹے اور مزدور کو پیداوار کا کچھ حصہ بطور اجرت دینے اور دلال یا منادی کرنے والے سے معاہدہ کرنے..... کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ یہ تمام معاہدات شرعی اصول کی رو سے اپنے منشاء کے غیر یقینی ہونے اور ان میں خطرے کا عنصر موجود ہونیکی وجہ سے باطل و کالعدم قرار پانے چاہئیں۔ لیکن بایں ہمہ اہلِ سنت و جماعت کے دو فقہی مذہب ان کو جائز تسلیم کرتے ہیں۔

قانون صرف عمل درآمد ہی کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ تبدیلیوں کا بھی ساتھ دیتا ہے۔ "یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ ہر وہ قانون جسکی بنیاد عمل درآمد یا رواج پر ہو رواج کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے ..... ایک طرف تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ قائم ہو چکا ہے ہم کو اسکی پیروی کرنی چاہیے کیونکہ ہم قانون وضع نہیں کر سکتے، قانون وضع کرنے کے لیے جس اقتدار کی ضرورت ہے وہ ہم کو حاصل نہیں

[1] سود میں مناسب اور غیر مناسب حد کا تخیل غیر اسلامی ہے۔ نیز یہ خیال کہ "ابتدائی" معیشتوں میں سود کی نوعیت کچھ اور تھی، اور موجودہ دور کی "انتہائی" معیشتوں میں کچھ اور ہے، یہ بھی کسی علمی حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض ایک وہم ہے۔ سود کی معاشی حیثیت اور اسکی اجتماعی مضرت جو پہلے تھی وہی آج بھی ہے۔ ترجمان القرآن

ہے۔ جو مسائل ہمارے روبرو پیش کیے جاتے ہیں ان کا حل ہم کو ان ہی اصول کے مطابق کرنا پڑتا ہے جو کتابوں میں مذکور ہیں۔ مگر دوسری طرف کسی ایسے قانون کو استعمال کرنا جسکی بنیاد قدیم رواج پر تھی لیکن جواب بدل چکا ہے رائے عامہ کے خلاف جانا اور مذہب سے اپنی ناواقفیت ثابت کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی کوئی قاعدہ کسی خاص زمانے کے حالات کے لیے بنایا گیا ہو تو اُن حالات کے بدلنے کے ساتھ وہ قاعدہ بھی بدل جائیگا جن کے تحت وہ بنایا گیا تھا"

اس ارتقاء کا مبنع حاکم یا امیر ہے۔ اس کی حیثیت ایک وکیل کی ہے۔ وہ اپنے اقتدار کو شرعی احکام کی جگہ تو استعمال نہیں کرسکتا البتہ وہ مسلمہ مذاہب میں سے کسی ایک کو ترجیح دے سکتا ہے۔ وہ کسی رواج کو اس قدر عام کرسکتا ہے کہ بالآخر وہ قانون بن جائے۔ سب سے آخر یہ کہ ضرورت کے وقت حالات کے اعتبار سے وہ اپنے اختیار تمیزی کو بھی استعمال کرسکتا ہے جیسا کہ ہر ایک اچھے امین کو اپنے امانت دہندہ کی طرف سے کرنا چاہیے۔

کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی قانون کے ارتقاء میں مذہبی تخیل کا کوئی حصہ نہیں؟ ایسا کہنا اس زبردست اتحاد خیال کا غلط تصور پیش کرنا ہے جو اسلام کی خاص قوت ہے۔ علم فقہ مذہبیات کا ایک حصہ ہے۔ شاید نصرانیت سے بھی زیادہ خلافت نے قدیم شہری مملکت کے تخیل کو محو کردیا لیکن اس توجیہ میں ہم کو بے راہ نہ ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر زیادہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مقننوں کا مفہوم نصرانیوں کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کا فرق سرکاری قانون اور خانگی قانون کے فرق سے زیادہ نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مذہبی تخیل کا بہت زیادہ اثر ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ بہ نظر اول کسی شخص کو معلوم ہوتا ہے۔ یہ اثر اُس اخلاقی رجحان میں موجود ہے جو مذہب نے قانون میں پیدا کردیا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ چیز شرعی احکام اور اخلاقی اصول کے باہمی تعلق میں مضمر ہے جو اکثر ایک دوسرے سے بالکل گھل

مل جاتے ہیں۔ شرکت، قرض، گواہوں کی اہلیت، آقا اور غلام کا باہمی تعلق، مدعی و مدعا علیہ، معاہدہ اور معاملہ غرض ہر وہ چیز جس کا موضوع قانونی تعلقات ہوں، اسلام میں اخلاقی شکل اختیار کر لیتی ہے، اور اس کی حیثیت ایک مجرد خانگی معاملے سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً امانت، باہمی امداد و اعانت کی ایک شکل ہے اس لیے کہ اس طریقے سے ایک شخص مالک جائداد کو اس کی جائداد محفوظ رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس حد تک یہ معاملہ خانگی ہے، مگر اسلام میں ایسا کرنے کی اس لیے سفارش کی جاتی ہے کہ اللہ فرماتا ہے "نیک کام میں ایک دوسرے کی مدد کرو" اور رسول اللہ (صلعم) فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی میں مصروف رہتا ہے اللہ بھی اس کی حاجت روائی کرتا رہتا ہے۔ جو شخص جان بوجھ کر ایسی چیز لیتا ہے جو اس کے لیے واجب الوصول نہیں تھی تو ایسا شخص اپنے سر دوگونہ ذمہ داری لیتا ہے۔ وہ صرف اس شخص ہی کا گنہگار نہیں ہوتا جسے اس نے دھوکا دیا، بلکہ ساتھ ہی اللہ کا بھی گناہ گار ہوتا ہے۔ جو قرض دار باوجود قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھنے کے ادا کرنے میں لیت و لعل کرتا ہے وہ ایک سخت گناہ کا ارتکاب کرتا اور اپنی نجات کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ پیغمبر (صلعم) نے پڑوسی کے تعلقات کے سلسلے میں بڑے ہی دلکش انداز میں فرمایا ہے کہ "تم کو معلوم ہے کہ ہمسایہ کا حق کیا ہے؟ اس کا حق یہ ہے کہ اگر تم سے مدد چاہے تو اس کی مدد کرو، اور قرض مانگے تو قرض دو، اور اگر تم سے اس کا کوئی کام پڑے تو پورا کرو، اور بیمار ہو تو عیادت کرو، اور مر جائے تو جنازہ کے ہمراہ جاؤ، اور اس کو کچھ بہتری حاصل ہو تو مبارک باد دو، اور مصیبت پڑے تو تعزیت کرو، اور بغیر اس کی اجازت کے اپنی عمارت اونچی نہ کرو کہ اس کی ہوا رُکے، اور اگر کوئی میوہ خریدو تو اس کو ہدیہ دو ورنہ چھپا کر اپنے گھر لاؤ، اور اپنے بچے کو میوہ لے کر باہر جانے نہ دو کہ اس کے بچے کو رنج نہ ہو، اور اپنی ہانڈی اور بگھار کی خوشبو سے اسکو ایذا نہ دو ورنہ اس کے ہاں بھی ایک چمچہ بھیجو"

اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ حق کا استعمال حقیقتاً ایک فرض کی ادائی سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر حق میں نیکی ہے تو اس کو "بغیر گناہ کے ترک کرنا" ناممکن ہے۔ جو شخص غاصب سے مال مغصوبہ حاصل کرتا ہے وہ ایک اخلاقی فریضہ بھی انجام دیتا ہے اس لیے کہ اگر وہ خاموش رہے تو گویا اس نے ظالم کو اپنا ظلم جاری رکھنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ پیغمبر (صلعم) نے فرمایا کہ "تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم"۔ صحابہ نے کہا کہ مظلوم کی مدد تو ہم سمجھ گئے مگر ظالم کی مدد کس طرح کریں؟ پیغمبر (صلعم) نے جواب دیا "اس کا ہاتھ پکڑ لو" (یعنی ظلم سے روک دو)۔ اس طرح ہر شخص کا حق صرف اس کا خانگی معاملہ نہیں بلکہ اخلاقی فریضہ بھی ہے۔ مگر اسکے ساتھ ہی اخلاقی قانون اور معاشری اغراض اس حق کی چند حدود متعین کر دیتے ہیں۔ مصالحت اور سمجھوتہ کر لینے کو بہر حال مستحسن مانا جاتا ہے۔ تاوان کی ممانعت ہے۔ قرض دار کے خلاف تکلیف دہ کارروائی شریعت کے خلاف ہونے کے علاوہ حق کا بیجا استعمال بھی ہے۔ "کوئی شخص اپنے حق کو اس طرح استعمال نہ کرے جس سے دوسرے کو صریح نقصان پہنچے"۔ ان معاملات میں اسلامی مقننوں کا احساس ہماری توقع سے زیادہ نازک واقع ہوا ہے۔ مثلاً جس شخص کے خلاف قانونی کارروائی کرنا مقصود ہو اسکے مخالف کو ایسی کارروائی کا مختار نہیں بنایا جاتا۔ اسی طرح جوان لونڈی کو بدکار کے ہاتھ فروخت نہیں کیا جا سکتا کہ مبادا وہ لونڈی کو حرام کی ترغیب دے یا اس کو بد اخلاق بنا دے۔ قانون کی حدود اور اس کی تجاویز ہر موقع پر اخلاقیات کے معیار پر جانچی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ بالکل ٹھیک کہا گیا ہے کہ "انسان کا کوئی حق ایسا نہیں ہے جس میں خدا کا حصہ نہ ہو"۔ خدا کا حصہ اس کا یہ حکم ہے کہ ہر ایک کو اس کا جائز حصہ دو اور دوسرے کے حق میں مداخلت نہ کرو۔ اس طرح اب ہم مجرد حق کے نقطہ پر پہنچ گئے ہیں جو تمام متمدن ملتوں کا مشترک حصہ ہے۔

اسلامی قانون کا نظام اپنی داخلی خصوصیات کے لحاظ سے یہی ہے۔ ماہرین کی نظروں میں وہ تحسین و تعریف کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اپنے ہم عصر ابتدائی جاگیری قوانین کے

بے ڈھنگے رسوم اور وحشیانہ رواجوں پر وہ بے حد فضیلت رکھتا ہے۔

اسلامی قانون میں ایک چیز کی کمی ہے جو اس کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے، یعنی ایک زیادہ تحلیلی رجحان۔ انفرادی خود مختاری کا رجحان اور تنظیم و اطاعت کی بنیادی عدم صلاحیت، عربوں کی سیاسی نا اہلیت کے اسباب ہیں اور ان کے قانونی نظام میں اخلاقی لحاظ سے یہی چیزیں کمزوری کا منبع تھیں[1]۔ اس کے ضعف کا دوسرا سبب یہ ہے کہ عربوں نے اپنے نظام کے بنیادی اصول میں بہت مبالغہ کیا ہے۔ انھوں نے اس تصور کو کہ انصاف عوض معاوضہ[2] کے اصول پر مشتمل ہے انتہائی حدود تک بڑھا دیا اور یہی حال یورپ کے دینی مقننوں کا ہے۔ یہ صورت حال ارسطو کے فلسفہ کی بھی کم سے کم اتنی ہی مرہون منت ہے جتنی کہ مذہبی عقیدوں کی۔ ہر حالت میں سود کی ممانعت، ہر قسم کے خطروں سے پرہیز، معاہدوں میں ہر قسم کی غیر یقینی چیزوں کو روکنا، مختصر یہ کہ اسلامی قانون کی تمام خصوصیات اسی اصول سے نکلتی اور اسی عام تصور پر منحصر ہیں کہ جن معاملات میں سود یا قمار یا غیر یقینیت کا عنصر شامل ہوتا ہے، ان میں فریقین کے درمیان منافع کے مساویانہ مبادلہ کا اصول ٹوٹ

---

[1] مصنف جس چیز کو عیب بتا رہا ہے وہی اصل اسلامی قانون اور نظام معاشرت کا حسن ہے۔ مصنف اس ملک کا رہنے والا ہے جس میں شخصیت کو اجتماعیت کے اندر گم کر دینے والا نظام تمدن (یعنی فاشزم) برسر عروج ہے۔ لہٰذا اسکی نگاہ میں یہ بات کھٹکنی ہی چاہیے کہ اسلام ہر ہر فرد کے اخلاقی، تمدنی اور معاشی حقوق کی حفاظت پر زور دیتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان جسقدر صحیح توازن اسلام نے قائم کیا ہے وہ کسی دوسرے نظام تمدن کو نصیب نہیں۔ یہاں نہ فاشزم کی طرح فرد کو جماعت میں گم کیا جاتا ہے، اور نہ مغربی ڈیماکریسی کیطرح فرد کو جماعت پر چھا جانے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ترجمان القرآن

[2] اجتماعی زندگی میں منصفانہ تعاون کی صورت بجز اس کے اور کیا ہے کہ ایک شخص دوسرے سے جو کچھ لے اسکے مقابلہ میں کوئی ہم وزن یا ہم قدر چیز اس کو دے۔ مصنف اس قاعدۂ کلیہ کے ہمہ گیر اطلاق کو ناروا مبالغہ قرار دیتا ہے، یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کبھی انصاف اس کو بھی قرار دیا جائے کہ آدمی لے تو لے مگر دے کچھ نہیں! - ترجمان القرآن

جاتا ہے اس لیے ساتھ ہی انصاف بھی مارا جاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مقنن کے پیش نظر ہمیشہ صرف توازن کو برقرار رکھنا ہوتا ہے یعنی ہر ایسی تجویز کی روک تھام جو اس اصول کے انطباق میں تکلیف پیدا کرے۔ مساوات ایسی ہونی چاہیے جس سے اعتدال کا مقصد فوت نہ ہو۔ یورپ میں قانون کلیسا کے ماہرین بھی یہی کہا کرتے تھے۔

اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے جو مسلسل جدوجہد کی گئی اسکی وجہ سے قواعد وضوابط میں زیادتی ہوئی، یعنی جزئیات کو منضبط کرنے کا رجحان جو ہر قسم کے کاروبار کو معطل کر دیتا اگر احکام کو کم و بیش ظاہری امکانی مفروضوں کے نظام سے نہ بچایا جاتا، یا اگر اسکا زیادہ حصہ خالص نظریاتی نہ رہتا۔

عربی قانون سے جو چیزیں اہل یورپ نے قطعی طور پر لی ہیں ان میں بعض تو قانونی ادارے ہیں جیسے محدود شرکت، اور بعض تجارتی قانون کی اصطلاحیں ہیں۔ لیکن اگر ان کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی قانون کے بعض اعلیٰ معیاری اجزا نے موجودہ یورپین تصورات کے نشو و ارتقاء میں مفید حصہ لیا ہے اور یہیں سے اسکی مستقل فضیلت کا پتہ لگتا ہے۔

بچوں کیلیے مفید کتابیں

رسالہ دینیات :۔ تصنیف سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ اسلام اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی کتاب آپ کو اردو زبان میں نہیں مل سکتی۔ قیمت ۱۰ر محصول ڈاک ۲ر

سرایا رسولؐ :۔ اس مختصر کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و خصائل، لباس، معاشرت، اخلاق اور آداب، اطوار اور عام طرز زندگی کے متعلق تمام معلومات جمع کی گئی ہیں۔ قیمت ۸ر محصول ڈاک ۱ر

ہمارے نبیؐ کے صحابہ :۔ اس کتاب میں صحابہ کرام کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دلنشیں انداز بیان کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ قیمت ۸ر محصول ڈاک ۱ر

ملنے کا پتہ :۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن۔ لاہور